22.4 ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ

ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز سے قبل اردو افسانے میں بغاوت کی آواز ''انگارے'' (1932ء) کی صورت میں بلند ہوئی۔ اس کی اشاعت ہی ترقی پسند تحریک کی بشارت اور اس کا پہلا غیر رسمی اعلان تھا جس کی وجہ سے پرانے مکتبۂ فکر کے لوگوں میں تہلکہ مچ گیا۔ اس مجموعہ میں شامل نو افسانوں نے فکر اور فن کا ایک نیا تصور پیش کیا جس کی بنا پر افسانہ نگاری کے معیار میں زبردست اضافہ ہوا۔

Scanned with CamScanner

خدیجہ مستور نے جو افسانے لکھے ہیں ان میں سماجی شعور پوری طرح سامنے آتا ہے لیکن وہ کہانی میں دلچسپی کا عنصر زیادہ نہیں پیش کر پاتیں۔ سنجیدہ فضا اور سوگوارانہ کیفیت کی وجہ سے ان کے افسانے ایک خاص تاثر رکھتے ہیں۔ اہم افسانوں میں مکھی، لالۂ صحرائی، دادا وغیرہ شامل ہیں۔

نوٹ: کرشن چندر، بیدی، منٹو، غلام عباس اور عصمت چغتائی پر ایک ایک اکائی اس کتاب میں شامل ہے۔ اس لیے یہاں ان کی افسانہ نگاری سے متعلق گفتگو نہیں کی جا رہی ہے۔

1936ء سے 1960ء تک کے دور میں اردو افسانہ موضوع اور تکنیک کی سطح پر انقلابی تبدیلیوں سے روشناس ہوا، اور ایسے ایسے تجربات کیے گئے جس نے اسے اعتبار اور وقار بخشا۔ مذکورہ تحریک سے وابستہ افسانہ نگاروں نے بے باکی اور صاف گوئی کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ حق اور انصاف کی حمایت میں انھوں نے بے دردی اور بے رحمی کا انداز اختیار کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسند افسانہ اپنے عہد کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس دور کے تقریباً تمام افسانہ نگاروں نے اپنی حقیقت نگاری کے زیر اثر دیہاتی زندگی کے ساتھ ساتھ قصباتی اور شہری زندگی بالخصوص متوسط طبقہ کو اپنا موضوع قرار دیا۔ جس کے نتیجے میں خارجی اور داخلی زندگی کی پیش کش کے عمل میں ان کے افسانوں میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کے بہترین عناصر اور اقدار کے تقریباً تمام پہلو سمٹ کر جلوہ گر ہو گئے ہیں۔ غرض ترقی پسند افسانہ نگاروں نے جہاں ایک طرف اپنی حقیقت نگاری کے زیر اثر ہم عصر ادبی، سماجی اور سیاسی مسائل کی حقیقی اور فنکارانہ پیش کش کے عمل سے اپنے عہد کے تقاضوں اور اپنے منصبی فرائض کو ادا کیا ہے وہیں انھوں نے اپنی کہانیوں میں ہم عصر سماجی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کر کے مشترکہ تہذیب و ثقافت کی تاریخ بھی قلم بند کی ہے۔ اسی لیے اردو افسانہ کی تاریخ میں یہ دور بہت نمایاں نظر آتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ”ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔“ کس کا قول ہے؟
2. ”آخری کوشش“ کس کا افسانہ ہے؟

REDMI NOTE 6 PRO
MI DUAL CAMERA

Scanned with CamScanner

حیات اللہ انصاری کی شہرت ان کے ناول ''لہو کے پھول'' کی وجہ سے ہے۔ لیکن وہ ایک اہم افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان کے افسانے تخیل اور مشاہدے کے خوبصورت اور متوازن امتزاج کی بنا پر اہم قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ایک خاص فلسفیانہ نقطۂ نظر ان کے افسانوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ زبان پر گرفت اور بیان کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ لطیف طنزیہ لہجے میں مسائل کو افسانے کا موضوع بنانے میں حیات اللہ انصاری کو کمال حاصل ہے۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ منطقی تسلسل و ترتیب کی وجہ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ انوکھی مصیبت، ڈھائی سیر آٹا، کمزور پودا اور بھرے بازار میں ان کے افسانے ہیں۔ افسانہ آخری کوشش کو خلیل الرحمٰن اعظمی نے اردو کے بہترین افسانوں میں سے ایک کہا ہے۔ ان کے بقول ''اس افسانے میں گہرائی، معنویت اور بنیادی مسائل کا عرفان پریم چند کے شہرۂ آفاق افسانے کفن کی یاد دلاتا ہے۔''

اپندر ناتھ اشک کا لہجہ قدرے تیزی اور ترشی لیے ہوئے ہوتا ہے۔ سیاسی شعور اور اصلاحی نقطۂ نظر ان کے افسانوں میں جا بجا نظر آتا ہے۔ وقار عظیم کے مطابق ان کے افسانوں میں گہرائی کم ہے اور مسائل کے صرف ظاہری پہلوؤں کی تصویر کشی ملتی ہے۔ افسانے کے فن پر اشک کو مہارت حاصل ہے۔ پلاٹ کی ترتیب سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ ان کے اہم افسانے کا کڑاں کا تیلی، بیگن کا پودا اور کھلونے وغیرہ ہیں۔

اختر اورینوی نے بہار کے دیہاتوں کے مسائل پر بڑے اچھے افسانے لکھے ہیں۔ وہ نچلے طبقے کو افسانے کا موضوع بناتے ہیں۔ سماجی جبر اور استحصال کو انہوں نے حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ابتدائی افسانوں پر جذباتیت حاوی تھی لیکن بعد کے افسانوں میں انہوں نے پختہ فنی شعور کا ثبوت دیا ہے۔ اختر اورینوی کے اہم افسانوں میں اندھی نگری، بوڑھی ماما، یہ دنیا پس منظر، شکور دادا، پناہ گزیں اور کلیاں اور کانٹے وغیرہ شامل ہیں۔ اختر کے یہاں جنسی مسائل پر بھی افسانے ملتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو فطری طور پر آگے بڑھاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ افسانے کا تاثر گہرا ہوتا ہے۔ پلاٹ میں وحدت ان کے افسانوں کی اہم خوبی ہے۔

اردو کے تین اہم افسانہ نگاروں نے پنجاب کے دیہی معاشرے پر قابل قدر افسانے لکھے ہیں۔ یہ ہیں سدرشن، بیدی اور احمد ندیم قاسمی۔ قاسمی کے تو افسانوی مجموعے کا نام ہی 'چوپال' ہے۔ قاسمی نے دیہاتی زندگی کے مسائل، دکھ درد، بھکمری، افلاس، قحط، سیلاب اور غربت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ قاسمی نے اچھی تعداد میں افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں گرداب، آبلے اور چوپال ہیں۔ عصری مسائل پر ان کے افسانے اپنی فنی و فکری بصیرت اور سماجی آگہی کی بنا پر شہرت رکھتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم پر ان کا افسانہ 'ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد' اس موضوع پر اردو کا سب سے اچھا افسانہ ہے۔ انسانی نفسیات کو بھی وہ اپنے افسانوں میں جگہ دیتے ہیں۔ ان کے کردار اپنی جذباتی کیفیت اور نفسیاتی الجھنوں کی بنا پر قاری کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ قاسمی کے قابل ذکر افسانے سناٹا، ارتقا، چوپال، نمک حلال اور کفارہ وغیرہ ہیں۔

دیوندر ستیارتھی نے نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے لوک گیتوں کو جمع کیا بلکہ اس صحرانوردی میں زندگی کے جو تجربات حاصل کیے انہیں اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کے اہم افسانوں میں گٹاری کے انڈے، جگنو ہی جگنو، پرانے پل، اگلا پڑاؤ، کانگڑی اور دوراہا وغیرہ شامل ہیں۔ قحط بنگال سے متعلق خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر کی طرح ستیارتھی نے بھی ایک قابل قدر افسانہ لکھا ہے ''نئے دھان سے پہلے''۔ یہ افسانہ ان کی فنی بصیرت کا ثبوت ہے۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں خواجہ احمد عباس کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے افسانے فنی اعتبار سے زیادہ کامیاب نہیں ہیں۔ وہ جذباتیت سے زیادہ کام لیتے ہیں اور واقعہ نگاری کو رپورتاژ کی شکل دے دیتے ہیں۔ تہذیبی و سماجی عوامل اور نفسیاتی محرکات کی جانب اشارے ان کے افسانوں میں کم ہی ملتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ اردو افسانے کو کوئی قابل ذکر کردار نہیں دے سکے۔ خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں ابابیل شہرت کا حامل ہے۔ ایک پائلی چاول بنگال کے قحط کے موضوع پر اچھا افسانہ ہے۔ ان کی کہانی سردار جی کافی متنازعہ رہی ہے۔ اس کہانی میں چند افراد سرداروں سے متعلق مضحکہ خیز لطائف بیان کرتے ہیں۔ بعد میں سردار کو فسادات میں ان کی جان بچاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ افسانہ بہت اچھا ہے۔ فنی اعتبار سے کمزور ضرور ہے لیکن موضوع کا حق عباس نے ادا کر دیا ہے۔

REDMI NOTE 6 PRO
MI DUAL CAMERA
Scanned with CamScanner

بیسویں صدی کے عالمی کیوس میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کے اسباب تلاش کریں تو اس کے منظرنامے پر پہلی عالمی جنگ (1914ء۔ 1919ء) اور انقلاب روس (اکتوبر 1917ء) کے بعد کے اثرات ابھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انسانی فکر میں زبردست تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ یہ احساس ابھرنے لگتا ہے کہ قومیں عزم و عمل سے بنتی ہیں جس کے لیے مجبوری و محکومی کی زنجیریں توڑنا ہوں گی۔ اس ذہنی بیداری کی فکر اور 1933ء میں نازی جرمنی میں ہٹلر کے آمرانہ رویہ نے دنیا بھر کے دانشوروں اور ادیبوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ قلم سے بھی تلوار کا کام لیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا وہ سب فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرات کے خلاف متحد ہونے لگے۔

نومبر 1935ء میں ڈنمارک اسٹریٹ لندن میں کچھ ہندوستانی دانشور، موجودہ صورتِ حال پر غور و فکر کے لیے اکٹھا ہوئے۔ یہ لوگ آکسفورڈ، کیمبرج، پیرس اور دوسری جگہوں پر زیرِ تعلیم تھے اور اپنی تعلیم مکمل کر کے جلد ہی ہندوستان واپس آنے والے تھے۔ ان ہی دانشوروں نے ہم خیال دوستوں کو متحد کیا اور ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن بنائی اور اس کا ایک منشور شائع کرایا جس کی کاپیاں ہندوستان کے مختلف گوشوں میں بھیجی گئیں۔ دسمبر 1935ء میں سجاد ظہیر جو اس انجمن کے روحِ رواں تھے، اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر الہ آباد آ گئے۔ انہیں دنوں حسن اتفاق سے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے زیرِ اہتمام اردو، ہندی ادیبوں کا اجتماع ہونے جا رہا تھا۔ سجاد ظہیر نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ترقی پسند تحریک کی راہ ہموار کی۔ اور اس کی پہلی کل ہند کانفرنس اپریل 1936ء میں لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس کی صدارت کے فرائض پریم چند نے انجام دیے۔ اُن کے اس طویل خطبۂ صدارت نے اس تحریک کو سب سے زیادہ تقویت پہنچائی:

> ''مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان پر تولتا ہوں۔ بے شک آرٹ کا مقصد ذوق حسن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے لیکن ایسی کوئی ذوقی، معنوی یا روحانی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔ مسرت خود ایک افادی شے ہے اور ایک ہی چیز سے ہمیں افادیت کے اعتبار سے مسرت بھی حاصل ہوتی ہے اور غم بھی۔ آسمان پر چھائی شفق بے شک ایک خوشنما نظارہ ہے لیکن اگر اساڑھ میں آسمان پر شفق چھا جائے تو وہ خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی کیوں کہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے۔
>
> ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ انہیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انہیں کی خوشیوں اور رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں، چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح و تفسیر آرٹ کا مقصد تھا۔ اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں۔ جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے۔ انہیں وہ انسانیت کے دامن سے خارج سمجھتا تھا۔ آرٹ نام تھا محدود صورت پرستی کا، الفاظ کی ترکیبوں کا، خیالات کی بندشوں کا، زندگی کا کوئی آئیڈیل نہیں، زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں۔''

(بحوالہ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، ص 43)

پریم چند کے زمانے میں دیہی مسائل و مصائب پر توجہ ضرور دی گئی لیکن شہر اور دیہات کو الگ الگ تناظر میں دیکھا اور پرکھا گیا جیسے خیر و شر اور ظالم و مظلوم کو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا گیا تھا جب کہ ترقی پسندی کے عہد میں یہ تخصیص تقریباً ختم ہو گئی۔ اس دور میں دونوں علاقوں کے متوسط اور پسماندہ افراد کو افسانوں کا موضوع بنایا گیا۔ زمینداروں اور تعلقہ داروں کے ساتھ ساتھ سرمایہ داروں اور مل مالکوں کے استحصال کو بھی دوٹوک لہجہ میں پیش کیا گیا۔ اس دور کے ممتاز افسانہ نگار عزیز احمد، غلام عباس، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، اختر حسین رائے پوری، دیویندر ستیارتھی، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، قاضی عبدالغفار، غیاث احمد گدی وغیرہ ہیں۔

Scanned with CamScanner

22.5 جدیدیت اور اُردو افسانہ

تقسیم ہند، ہجرت اور غریب الوطنی کے مسائل نے جو گہرے زخم دیے تھے وہ رفتہ رفتہ مندمل ہوئے۔ ان سے وابستہ موضوعات کے اثر
بھی کم ہوئے۔ ترقی پسند ادبی تحریک کی گرفت بھی کمزور ہونے لگی جس کی وجہ سے حقیقت نگاری کی روایت جو سماجی اور نفسیاتی زاویوں سے معاشر
دیکھ رہی تھی، اپنا اثر کھونے لگی۔ 1955ء کے آس پاس جدیدیت کا رجحان فروغ پانے لگتا ہے۔ اجتماعیت کے مقابلے میں فردیت اور خارجیت
مقابلے میں داخلیت زور پکڑتی ہے اور منجھی ہوئی مانوس اور مربوط زبان کے بجائے قدرے ناہموار بلکہ کبھی کبھی نامانوس زبان کا استعمال شروع ہوتا
اور یہ تصور پنپنے لگتا ہے کہ پلاٹ، کردار، واقعہ، فضا اور ماحول کے بغیر بھی افسانہ بن سکتا ہے۔ اس تصور کے تحت شعور کی رو اور آزاد تلازمۂ خیال طا
پیرائیہ اظہار کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ علامتی اور تمثیلی افسانوں کے ساتھ تجریدی افسانے منظرِ عام پر آتے ہیں جن میں نئی حسیت اور فن کے
راستوں کا انتخاب نظر آتا ہے۔ اس دور کے ممتاز افسانہ نگار قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، بلراج مین را، انور سجاد، کلام حیدری، احمد ہمیش، سریندر پرک
دیویندر اسر، نرمل ورما، خالدہ حسین، جوگیندر پال، غیاث احمد گدی، رشید امجد وغیرہ ہیں۔

Scanned with CamScanner

قرۃ العین حیدر بحیثیت ناول نگار زیادہ مشہور ہوئیں اور ان کے اہم افسانے بھی طوالت کے اعتبار سے ناولٹ کہے جا سکتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے ہند ایرانی تہذیبی قدروں کا زوال نہ صرف یہ کہ دیکھا ہے بلکہ اسے اپنی تخلیقات کا حصہ بھی بنایا ہے۔ ملک کی گنگا جمنی تہذیبی وحدت کا بکھراؤ ان کے افسانوں کا موضوع ہے۔ وہ شائستگی، نفاست اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کو عزیز رکھتی ہیں اور فنی بصیرت سے اپنے افسانوں کا موضوع بناتی ہیں۔ انہوں نے فرد کی تنہائی اور کرب کو بھی افسانوں کا موضوع بنایا ہے لیکن یہ کرب بھی سماجی انتشار اور بکھراؤ کا ہی پیدا کردہ ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے بھی ان کے افسانے اہم ہیں۔ ''شعور کی رو'' کی تکنیک کا استعمال انہوں نے فنکارانہ بصیرت کے ساتھ کیا ہے۔ حسب نسب، آئینہ فروش شہر کوراں، فوٹو گرافر، روشنی کی رفتار، یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے، ڈالن والا، جلاوطن وغیرہ ان کے اہم افسانے ہیں۔ طویل افسانوں میں ہاؤسنگ سوسائٹی اور چائے کے باغ مشہور ہیں۔

انتظار حسین اپنے داستانی اسلوب اظہار کے لیے جانے جاتے ہیں۔ ہجرت کا المیہ ان کے افسانوں کا غالب موضوع ہے۔ تہذیبی جڑوں کی تلاش اور ماضی کی روایات کی بازیافت کے ساتھ انہوں نے داستان، جاتک، بدھ مت، تصوف، اساطیر اور برصغیر کی پانچ ہزار سالہ تہذیب کو جس خوبصورتی اور تخلیقی بصیرت سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے، اس نے انتظار حسین کو جدید افسانہ نگاروں میں معتبر ترین حیثیت عطا کی ہے۔ ان کے اہم افسانے آخری آدمی، زرد کتا، ایک بن لکھی رزمیہ، خالی پنجرہ، کچھوے، شہر افسوس اور ایک خط ہندوستان سے، ہیں۔

جدید علامتی افسانہ کا ایک اہم نام بلراج مین را ہے۔ مین را کے افسانے جدید استعاراتی اور علامتی اسلوب بیان کے کامیاب نمونے ہیں۔ فرد کی ذلت، مشینی دور کے انسان کی بے سروسامانی اور تنہائی کا کرب ان کے افسانوں میں جدید تخلیقی حسیت کے رنگ و آہنگ سے متصل ہو کر ایک ایسا تجربہ بن جاتا ہے جو قاری کو بھی اپنا معلوم ہوتا ہے۔ ماچس مین را کا بے حد اچھا افسانہ ہے۔

سریندر پرکاش نے افسانوں میں انسان کے ذہنی مسائل کو پیش کیا ہے۔ وہ استعاروں اور علامتوں سے کہانی کا تانا بانا بنتے ہیں۔ دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم ان کا ایک اہم افسانہ ہے۔

انور سجاد نے سامراجی، سیاسی اور سرمایہ دارانہ استبداد کو بڑی خوبی سے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ یوریکا، کونپل اور دوسرے افسانے جبر و استبداد اور معاشی استحصال کی فنکارانہ پیش کش کے حامل ہیں۔

جدید افسانہ ترقی پسند ادب کے دورِ شباب میں ہی منظر عام پر آ گیا تھا۔ اکثر نقادوں کا خیال ہے کہ یہ ترقی پسند ادب کے خلاف ردِعمل تھا۔ ترقی پسند افسانہ نگار انسان کی ناآسودگیوں، محرومیوں، تکلیفوں اور کرب ناکیوں کی وجہ سماجی ناانصافی، معاشی ناہمواری، طبقاتی استحصال اور سیاسی ظلم و ستم کو قرار دیتا تھا۔ اور اس طرح سماجی اور معاشی انقلاب کے ذریعہ انسان کے انفرادی دکھ درد اور اس کے ذاتی مسائل کو حل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے سامنے فرد سے زیادہ معاشرے کی اہمیت تھی اور وہ معاشرتی تبدیلیوں میں ہی فرد کے تمام انفرادی مسائل کا حل تلاش کرتا تھا۔ جبکہ جدید افسانہ نگاروں کا زندگی اور اس کے مسائل کو سمجھنے اور پرکھنے کا انداز انفرادی تھا۔ اس لیے انہوں نے صنعتی دور کے انسان کی معاشی بدحالی اور سماجی پس منظر کے مقابلہ میں اس کی فکری اور جذباتی ناآسودگی، داخلی شخصیت کے انتشار، اقدار کی شکست و ریخت اور صنعتی معاشرے کے مسائل کو [illegible] افسانہ نگاروں نے اظہار کے لیے بیانیہ اسلوب اختیار کیا تھا اور جدید افسانہ نگاروں نے علامتی طرزِ اظہار کو اپنایا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ''جلاوطن'' کس کا افسانہ

REDMI NOTE 6 PRO
MI DUAL CAMERA

Scanned with CamScanner

22.6 موجودہ صورتِ حال

جدیدیت نے بیانیہ انداز سے انحراف برتا تھا۔ اُس نے پھیلاؤ کے بجائے ارتکاز سے کام لیا تھا لیکن مابعد جدید دور بیانیہ کی واپسی کا دور ہے۔ اس دور میں ابہام و تجرید کی جگہ بیانیہ افسانہ لکھنے کا رجحان بھی بڑھا ہے اور استعاراتی اور علاماتی انداز بھی پروان چڑھا ہے۔ آج کہانی کا مرکز و محور انسان کی ذات ہے جس کے تجربات کی عکاسی مختلف زاویوں سے کرتے ہوئے تہہ بہ تہہ پرتیں کھولی جارہی ہیں۔ موجودہ دور کے منتخب افسانہ نگار قاضی عبدالستار (پیتل کا گھنٹا)، سلام بن رزاق (انجام کار)، نیر مسعود (طاؤس چمن کی مینا)، شوکت حیات (گھونسلا)، انور خان (اپنائیت)، عبدالصمد (شہر بند)، سید محمد اشرف (ڈار سے بچھڑے)، انور قمر (کابلی والا کی واپسی)، بیگ احساس (حنظل)، مظہر الزماں خاں (پہلے دن کی تلاش میں) اور طارق چھتاری (نیم پلیٹ) وغیرہ ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے محسوس کیا کہ اگر کل فکشن میں انفرادیت اور انوکھے پن کی تلاش تھی تو آج زندگی کے حقائق کی غیر مشروط جستجو اور شناخت پر توجہ مرکوز کرنا چاہیے۔ زندگی اور فن دونوں میں نمایاں فرق آچکا ہے اور یہ فرق افسانہ کے اسالیب میں بھی منعکس ہوکر رہے گا۔ مذکورہ رجحان کے نمائندوں نے ترقی پسندوں کی یک رخی حقیقت نگاری سے اجتناب کیا اور جدیدیت کی ابہام پسندی اور تجریدیت سے بھی دامن بچایا۔ البتہ دونوں اسالیب کے بہتر عناصر کو قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کیا۔ اس کسبِ فیض کی وجہ سے کہانی میں کہانی پن کی واپسی ہوئی اور تمثیلی پیرائے کو وسعت ملی۔ شہر، قصبہ اور دیہات کی نمائندگی کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ آج کے افسانہ نگاروں نے فرق یہ کیا کہ وہ اپنے اطراف کی زندگی میں اسی قدر شامل ہوگئے جس قدر کہ ان کے کردار۔ انھوں نے فرد کی ذاتی سوچ اور نجی مجبوری کو اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی کہ ہمارا پورا سیاسی اور سماجی نظام کہانی کی گرفت میں آسکے۔ اور پھر انھوں نے باریک بینی سے اس نظام کو تہہ در تہہ سمجھنے اور اپنے فن کے لوازم کے ساتھ حاصل شدہ بصیرت کو پڑھنے والے تک پہنچانے کا جتن کیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے افسانہ لکھنے والوں نے تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کو اس طرح برتا کہ وہ خارج سے مُسلط کی ہوئی نظر نہ آئیں بلکہ فن پارے ہی سے نکل کر اور باہم دگر مربوط ہوکر ایک وحدت تشکیل دیں۔ اس کاوش کی بدولت جدید افسانہ کا ایک ایسا پیرائیہ اظہار وجود میں آچکا ہے جس میں قوتِ بیان بھی ہے اور تخیل کی جدت بھی۔ اِسی وجہ سے آج اردو افسانہ کو مقبولیت بھی حاصل ہے اور اعتبار بھی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ''کابلی والا کی واپسی'' کس کا افسانہ ہے؟ انور قمر۔
2. نئے افسانہ نگاروں نے تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کو کس طرح برتا ہے؟

Scanned with CamScanner